کائناتِ روحانی

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
مقدمہ ومرسلہ: مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

(دوسری اور آخری قسط)

بہر حال میں کیا کہنے لگا، غرض یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ مسئلہ بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ جس حکمت بالغہ نے ہم کو یعنی ہماری روحوں کو ہیکل جسمانی کے ساتھ وابستہ کیا ہے، اسی نے محض اپنے فضل عمیم، لطف کریم سے اس ہیکل کے بقاء وصحت، نشو ونما کے لیے ہر طرح کے سامان ہمارے اردگرد پھیلا دیئے ہیں اور پھر اسی نے ہمارے اندر ایسی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں، جن کی راہنمائی سے ہم ان تمام چیزوں پر تسلط حاصل کرلیتے ہیں۔

بسیط زمین اور فضاء کائنات کے اس مادی سلسلہ میں جہاں تک غور کیا جائے گا، یہ بات قطعاً واضح ہوتی جائے گی کہ انسان اپنے مادی ڈھانچے کی پرورش کے لیے جن جن چیزوں کا محتاج ہے، اس کے مہیا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی گئی ہے۔

بدبخت نہ سوچنے والی قومیں کچھ ہی کہیں، لیکن بنی آدم کے بلند اختر قبیلوں نے اس کا اقرار کیا اور ہمیشہ اقرار کرتے رہتے ہیں۔ کاہلوں کو اپنے جسم کے پالنے میں تکلیف ہوتی ہوتو ہو، ان کے پچھتر فیصدی افراد کو چوبیس گھنٹوں کے اندر دو دفعہ بھی پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا ہوتو نہ ملے، لیکن قدرت پر یہ الزام غلط ہے۔ رونا اپنی عملی قوتوں کی بے کاری پر چاہیے، ماتم ان زنگ آلود جمودی طاقتوں پر کرو جو اِن سب میں ہیں، لیکن آہ! کہ کچھ دنوں سے کسی میں نہیں۔ ان کے پاس اگر سردی سے بچنے کے لیے اچھے کپڑے نہیں ہیں تو یہ جھوٹ ہے کہ خزائن السموات والارض میں ایسے کپڑے نہیں ہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ اس خزانہ سے حاصل کرنے کے لیے جس سعی اور کوشش کی ضرورت ہے، وہ ان میں نہیں ہے۔ قرآن حکیم کا اعلان ہے:

''وَقَدَّرْنَا فِيهَا أَقْوَاتَهَا سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ۔''

''اور ہم نے زمین میں تمام ذخیرے ناپ تول کر رکھ دیئے ہیں، جو ہر ایک جستجو کرنے والے کے لیے برابر ہیں۔''

پس جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اس کے لیے کھولا جائے گا، وہ جو کنڈی نہیں ہلاتا' اگر اس کے لیے

دروازے نہیں کھلتے تو حسرت کس پر ہے؟ ''کتابِ روشن'' میں تو تم سے کہا گیا تھا کہ:

''هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔''

''اس نے تمہارے فائدہ کے لیے زمین کو تمہارے لیے بالکل رام کردیا ہے، پس اس کے کندھوں پر چلو پھرو اور اسی کی پیداوار کو کھاؤ (اور یاد رکھو) کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

اویم زمیں سفرۂ عام اوست — چہ دشمن بریں خوانِ یغما چہ دوست

پھر جس میں سرپوش اُٹھانے کا بھی سلیقہ باقی نہیں رہا ہے، وہ دسترخوان پر اگر نہیں بیٹھ سکتا تو اپنے سلیقہ کا ماتم کرے، خوانِ یغما کا کیا قصور؟!

لیکن جہاں اس چرم واستخوانی ہیکل کی تربیت وپرورش کے لیے خالق القویٰ والقدر نے مواد کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ پھیلا دیا ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، انسان خدا جانے کس زمانہ سے اس کے ختم کرنے میں مصروف ہے، لیکن وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتے۔

وہیں یہ کس قدر عجیب اور کتنا حیرت انگیز سانحہ ہے کہ بعض سیاہ بھیجوں نے محض اپنی ازلی شقاوت اور انتہائی کورباطنی کے ساتھ قدرتِ قاہرہ جلیلہ فیاضہ پر یہ گستاخانہ اور ناپاک حملہ کردیا کہ قدرت نے اگرچہ فانی جسموں اور تباہ ہونے والے ڈھانچوں کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے، لیکن وہ جو اصل جوہر ذات ہے اور حقیقتِ انسانیہ اسی سے عبارت ہے بلکہ واقع میں انسان وہی ہے، اس کے معاملہ میں انتہائی بخل اور غایت تنگ دلی سے کام لیا گیا ہے، حتیٰ کہ اب ان چرمی زبانوں سے یہ آواز بغیر کسی تذبذب کے عام طور سے نکل رہی ہے کہ اس کے لیے اس ساری کائنات میں کچھ نہیں ہے، کائنات کے سلسلۂ حوادث کی کوئی کڑی اس مقصد کے لیے مفید نہیں۔ العظمة للّٰه ! یہ سنتا ہوں اور میرے ہوش وحواس پر اختلال طاری ہوا جاتا ہے، یہ کیا کہا گیا کہ اگر دانت میں کوئی معمولی سی چیز اَٹک جاتی ہے تو اس کے نکالنے کے لیے اس عالم میں ہزاروں قسم کے خلال غیرمحدود مقدار میں موجود ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ کیسا دعویٰ ہے کہ انسان کے دانت میں نہیں، بلکہ خود اس کے اندر اگر ہمیشہ کے لیے تباہ کرنے والی چیز اَٹک جائے تو اس ساری کائنات میں اس کا کوئی علاج نہیں۔ آخر یہ کس دیوانے نے کہا اور کن ابلہوں نے باور کیا کہ ہمارے جوتوں کے میل صاف کرنے کے لیے تو اس عالم میں ہزاروں سامان موجود ہیں، لیکن اگر خود ہم پر گرد پڑ جائے اور ہمارے اندر میل بیٹھ جائے تو اس کے لیے فیاض قدرت نے کچھ نہیں رکھا؟! خدانخواستہ اگر ایسا ہے تو پھر قدرت کی بے مثال فیاضی جس کا ظہور ذرہ ذرہ میں بدیہی طور پر محسوس ہو رہا ہے' کیا ایسا لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا؟!

آخر ہم ان مادوں کو لے کر کیا کریں گے جو ہمارے جسم کی تو مدد کرسکتے ہیں، لیکن خود ہماری اعانت سے مجبور ہیں؟! اگر یہ صحیح ہے کہ ہمارے استخوانی ہیکل کے لیے تو سب کچھ کیا گیا ہے اور خود

ہمارے لیے کچھ نہیں ہے تو پھر یقیناً یہ کہنا ہی بالکل درست ہے کہ اس ہماری کائنات میں انسان کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس ذخیرہ میں ہمارے نفع کے لیے کچھ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد قطعاً یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہمارے سامنے ہے، اس میں انسان کے آرام وعیش وسرور ونشاط کے سامان نہیں، بلکہ دُکھ درد، تکلیف ومصیبت کی آگ بھری ہوئی ہے۔ مجھے عقل دی گئی ہے اور میرے سامنے گندھک، شورہ، سیسہ، لوہا اور اسی طرح کے دوسرے مواد پھیلا دیئے گئے ہیں، تاکہ میں ان سب کو ملاجُلا کر وہ چیزیں تیار کروں جن سے انسانی جوڑ بند کھل جاتے ہیں، ترکیب اعضاء کی تباہ ہوجاتی ہے، ان کی آبادیاں خاک میں مل جاتی ہیں۔

میرے سامنے مادہ کا یہ انبار کیوں لگایا گیا ہے، جبکہ میری یعنی میری روح کی درستی کے لیے ایک تنکا بھی نہیں پیدا کیا گیا؟! اگر میری روح اور میری حقیقت کی پرورش کے لیے کچھ نہیں تھا تو پھر میرے ڈھانچے کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا، تاکہ روحانی ضعف سے مجبور ہوکر اگر میں کچھ کرنا چاہتا تو بجائے بندوق چلانے کے صرف دانت نکال کر دوڑتا، سینگوں کی جگہ صرف اپنے ناخن سے دوسروں کو نوچتا، میرے جنوں کا اثر محدود ہوتا، میری دیوانگی عالمگیر نہ ہوتی اور بالفرض اگر کبھی میں اپنی مذبوحی حرکتوں سے تھک کر گر بھی پڑتا ہوں تو اس وقت بھی ان مادوں سے مجھے کسی قسم کی تسلی نہیں ہوتی، میں اپنے پیٹ میں ان ہی مادوں کو مختلف الوان واشکال کی صورت میں ٹھونستا ہوں اور چینی کی رکابیوں سے اُٹھا اُٹھا کر ٹھونستا ہوں، مگر پھر جب غور کرتا ہوں تو گو کیسۂ شکم بھر جاتا ہے، لیکن مجھ میں پھر بھی وہی خلاء باقی رہتا ہے، میری اندرونی بےچینی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ہم اپنی اس چرمی کالبد کو روئی کے ریشوں اور اون کے بالوں، ریشم کے تاگوں سے منڈھتے رہتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی اس میں نمونے کے تار اور موتیوں کے ہار کو شریک کر لیتے ہیں، لیکن جب اپنے اوپر نظر ڈالتے ہیں تو اپنی حقیقی بےسروسامانی میں کسی قسم کی تخفیف نہیں پاتے۔

انسان کا جسم مادہ کی غذا تلاش کرتا ہے، لیکن خود انسان اس غذا سے اپنے اندر اطمینان کی خنکی نہیں پاتا، اور جو دیوانہ پاتا ہے وہ شاید اطمینان کی برودت وسکینت سے ہی ناآشنا ہے، شاید اس نے اطمینانی سرور کے ساتھ اس کرۂ ارضی پر کبھی سانس نہیں لی۔

ہاں! میں نے کائنات کے اس عریض وطویل سلسلے کو دیکھا اور بغور دیکھا، اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی مجھے اس وقت تک ضرورت ہے، جب تک کہ اس زمین پر چل پھر رہا ہوں تو کیا جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور یقیناً چلا جاؤں گا تو قدرت نے میرے لیے وہاں کوئی سامان نہیں کیا؟! اگر وہاں نہیں کیا ہے تو پھر یہاں اتنی خاطر مدارات کی کیا ضرورت تھی؟! میں خوب جانتا ہوں کہ جب اس زمین سے میں اُٹھالیا جاؤں گا تو پھر میں پنجاب کے گیہوں کو نہیں دیکھ سکتا، گنگا مجھے اپنا پانی نہیں

پلاسکتی، برار کی روئی وہاں نہیں جاتی، مانچسٹر کے تھان اور نیویارک کی قندیلوں کی مانگ وہاں نہیں ہے، تو کیا میں وہاں ننگا کردیا جاؤں گا، بھوک سے مروں گا، پیاس سے تڑپوں گا، اندھیرے میں بھٹکوں گا؟!

آہ! کہ اگر ایسا ہے تو کیا اس زمین پر میں صرف اس لیے آیا تھا کہ میرا مذاق اُڑایا جائے؟! کیا میں واقعی کسی کا مسخرا ہوں؟! یہ چیزیں یہاں مجھے محض بطور دل لگی کے دی گئی تھیں؟! تاکہ میں جب ان سے خوش ہوجاؤں تو مجھے پاگل و دیوانہ بنانے کے لیے ان سب کو ایک ایک کرکے مجھ سے چھین لیا جائے اور میں ان کی تلاش وجستجو میں اِدھراُدھر مارا پھروں اور مذاق کرنے والا میری اس بھنکم جستجو کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو؟!

نہیں تو کیا ایسا ہے کہ اس زمین کی زندگی (یعنی خود میں) ہمیشہ کے لیے معدوم کردیا جاؤں گا، میرا اس کے بعد کچھ پتہ نہ ہوگا، نہ یہاں ہوں گا اور نہ کہیں اور ہوں گا؟! اگر ایسا ہے تو پھر فیاض قدرت جس کی جود وکرم کا یہ کچھ چرچا ہے، کیا اس نے مجھے اپنا شکار بنایا؟! وہ فیاض نہیں، بلکہ دانہ دے کر چھری پھیرنے والا صیاد ہے، کیا میرے گلے پھڑے میں مادیات کا آٹا اس لیے اُتارا ہے، تاکہ جب میں اُلجھ جاؤں تو زور سے جھٹکا دیا جائے، کھینچا جائے اور پھر اس کے بعد میری ہستی ہمیشہ کے لیے برباد کردی جائے؟! تو کیا میں قدرت کی غذا ہوں یا اس شغل سے اس کا جی بہلتا ہے کہ مجھے دانے دے دے کر مارے، کاٹے تباہ وبرباد کردے؟!

اللہ اللہ! اس مسافر نواز شخص کو میں کیا کہوں جس نے راہ میں میرے لیے پانی کے مٹکے رکھے، کھانے کے لیے میوہ دار درخت لگائے، درختوں کی شاخوں پر دسترخوانوں میں لپیٹ کر ہر طرح کی غذا بھی رکھ دی، میرے لیے تھوڑی تھوڑی دور پر اُس نے دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے فرش وفروش، لحاف وبستر سے آراستہ مکان بھی بنادیئے، یہ سب کچھ کیا، لیکن جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو اس نے میری گردن بلا وجہ اُڑادی، میرا سامان بھی چھین لیا، حالانکہ اس کو نہ میری ضرورت تھی، نہ میرے گوشت واستخوان کی اور نہ میرے کپڑے لتے کی، یقیناً اگر میری زندگی اسی خاک داں تک ختم ہوجاتی ہے تو قدرت کے متعلق بے ساختہ ہر شخص کی زبان سے وہی الفاظ نکل پڑیں گے جو اس مسافر نواز کے لیے تجویز کیے جاسکتے ہیں، کیا اس کے بعد کائنات اور اس کا مرتب نظام ایک فعل عبث، امر باطل، شغل لایعنی سے زیادہ کوئی رُتبہ حاصل کرسکتا ہے؟! لیکن الحمد للہ! کہ بجز دیوانوں کے جن کا اثر صرف ابلہوں تک محدود ہے، عالَم نے اس خیال کو جھٹلایا، اور ہمیشہ اکثریت نے اس کو جنون اور ہذیان قرار دیا۔ بنی آدم کے برگزیدہ نفوس، بے لوث اور گرامی ہستیوں نے جب کبھی نظامِ تکوینی کے اس مرتب ومُتَّسق سلسلے کو دیکھا تو ان کی مقدس روحوں سے غیبی آوازوں میں یہ صدا آئی:

''إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَکَ۔''

''بلاشبہ آسمان وزمین کی پیدائش اور رات دن کے اُلٹ پھیر میں کثرت سے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جن کے اندر مغزِ عقل ہے، وہ ان کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ: اے پروردگار! تو نے ان چیزوں کو بے کار پیدا نہیں فرمایا کہ تیری ذات لغویت سے پاک ہے۔''

ہاں! یہ قطعاً غلط ہے کہ جس نے میرے گوشت کے لوتھڑوں اور ہڈیوں کی پرورش ونشو ونما کے لیے یہ کچھ سامان کیا ہے، اس نے میرے لیے میری ذات کے لیے کچھ نہیں کیا، ہو نہیں سکتا کہ جس نے محض میرے جوتے کی گرد پونچھنے کے لیے طرح طرح کی چیزیں مہیا فرمائی ہوں، اس نے خود میرے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔

بلاشبہ ہم کو یہ واثق یقین کرنا چاہیے کہ اس فیاض ہستی نے اس چیز کو بھی ضرور پیدا کیا ہے، جن کی طرف میرا جوتا اور میری چھڑی نہیں بلکہ خود میں محتاج ہوں، میری ذات محتاج ہے، میری حقیقت محتاج ہے، جن کا سراغ مواد کے ذخیروں میں نہیں ملتا، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو اس ذخیرے میں نہیں ہے وہ واقع میں بھی نہیں ہے، تو کیا قدرت اس قدر عاجز ولاچار ہے کہ اس کی ساری ایجادی زورآزمائیوں کا دائرہ اسی کثیف مادے تک محدود ہے؟! کیا وہ اس سے زیادہ لطیف، زیادہ قدوس، زیادہ پاکیزہ چیز نہیں پیدا کرسکتی جس کو ہمارے جسم سے نہیں، بلکہ ہماری لطیف ذات سے مناسبت ہو؟! اس مادی ذخیرہ میں جتنی چیزیں ہیں ان کا سلسلہ فقط میرے مادۂ جسدی سے مل سکتا ہے، لیکن جس چیز کی قدر میرے گوہر پاک کو ہے، اگر وہ ان تاریک وظلماتی ڈھیر میں نہیں ملتی تو کوئی حرج نہیں کہ وہ اس میں مل بھی نہیں سکتی، مگر پھر بھی اگر وہ مادی کائنات کے دائرہ میں نہیں تو کائنات کے دائرہ میں ضرور ہے، کیونکہ ہم بھی اسی کائنات میں اس لیے ہیں، اس کو بھی اسی کائنات میں ہونا چاہیے۔

نازک احساس والوں نے آخر اُسے ڈھونڈا اور اسی کائنات کے احاطہ میں پالیا، حتیٰ کہ آخر میں یہ ان ہی کا اعلان ہے کہ یہ امر مقدس قدرت کی فیاضیوں کا وہ پاک سلسلہ ہے جس کو ہم کبھی وحی، کبھی نبوت، کبھی رسالت کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں، کمزور سمجھوں کے انسان کہتے ہیں کہ ان ضرورتوں کے لیے ہم قدرت کی طرف سے بے نیاز ہیں، ان حاجتوں کو خود ہمارا دماغ پورا کرسکتا ہے اور کرتا ہے، لیکن جو انسان اپنی ایک معمولی پھنسی کے لیے قدرت کی طرف ہاتھ پھیلانے کے لیے مجبور ہے، وہ کس طرح مدعی ہوسکتا ہے کہ اس کے جسم میں نہیں، بلکہ خود اس کے اندر جو گھاؤ ہیں ان کو وہ بغیر تائید قدرت کے اچھا کرلے گا؟! اگر اس پر بھی وہ مصر ہے تو اس دیوانے کو چھوڑ دو، تاکہ اس کا زخم زخم بوزینہ بن کر رہے، وہ اسی کے اندر تڑپے پھڑکے، مر بھی نہیں سکتا کہ یہ پھوڑا اس کے جسم میں نہیں، بلکہ اس کی جوہر ذات میں ہے، انسان اپنے جسم کو چھوڑ سکتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے، پھر اپنے آپ کو اپنے سے کس طرح علیحدہ کرسکے گا؟!

لیکن ایک عقلمند یہ کبھی نہیں کرسکتا، وہ جب اپنی مونچھ کے بالوں کے تراشنے کے لیے بھی لوہے کی کان میں جھانکنے کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے تو پھر اس کی سمجھ میں یہ کس طرح آسکتا ہے کہ اپنی ذات کی

غیر فطری صفات کی قطع و برید کے لیے قدرتی چیزوں سے بے نیاز رہے؟! وہ جس سے اپنی جسدی ضروریات کو مانگتا ہے اور اس سے مانگنے میں نہیں شرماتا، اسی سے اپنی ذاتی حاجات کو بھی طلب کرے گا، اور طلب کرتا ہے، پاتا ہے، کامیاب رہتا ہے، کامیاب جاتا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہے گا: ''**أُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ**'' ..... ''یہی لوگ کامیاب ہیں ۔'' اس کی نگین ہستی پر ہمیشہ کے لیے منقوش کر دیا جاتا ہے۔

بہر حال بات کہاں سے کہاں پہنچی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ:

جس طرح ہیکل جسمانی کے لیے مواد کا ایک اجمالی ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے، جس کو ہم ''مادی کائنات'' کہتے ہیں اور روزمرہ اپنی جسمانی ضرورتوں کو اسی سے نکال نکال کر پوری کر رہے ہیں، ٹھیک اسی طرح سلسلۂ موجودات میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو ظاہراً اسی طرح مجمل ہے جس طرح مثلاً زمین کا مادہ، لیکن جب سوچنے والوں اور ڈوبنے والوں نے اس کی تحلیل وتفصیل کی تو انسانوں کے لیے ان منافع کا ایک دریا بہ پڑا، جن کا تعلق انسان کے جوہر ذات اور اصل حقیقت سے ہے اور اسی سلسلہ کو ہم ''روحانی کائنات'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسی مقدس سلسلۂ فیوض نے آغازِ آفرینشِ بنی آدم سے ہمیں بتایا کہ مواد کے استعمال کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ ہم ان کو بجائے خوں ریزی، شرانگیزی، جنگ وقتال کے اپنی سلامتی اور امن وآسائش کا ذریعہ کس طرح بنا سکتے ہیں؟!

سچی مدنیت، پاکیزہ مسرت افزاء حضارت کیونکر پیدا ہوسکتی ہے؟! اجتماعِ افراد کو مفاسد، وخبائث، شرارت اور بے چینی کے زہروں سے کس طرح مُصَفًّا کیا جاسکتا ہے؟ پھر اسی قدوس فیض قدرت نے ہمیں سمجھایا کہ جب ہم اس زمین کو چھوڑ دیں گے تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟ اور وہاں پُرامن زندگی' سلامتی اور راحت کے ساتھ کیوں کر مل سکتی ہے؟! اسی نے یہ بھی بتایا کہ اس کائنات کی اصلی غرض کیا ہے؟ مواد کا اتنا طویل وعریض جال کس لیے بچھایا گیا ہے؟ اور انسان اس پر کس لیے قابض ہے؟! کائنات اگر اس کے لیے ہے تو خود وہ کس کے لیے ہے؟! ہم نے قدرت کی اس رحمتِ عامہ کو پہچانا، دیکھا، سمجھا اور اسی کے بعد وہ تمام نجس باتیں برباد ہوگئیں، جو قدرت کی تنگ نظری یا عبث کاری کے متعلق ناپاک کھوپڑیوں میں پیدا ہوتی تھیں، اس کی رحمتِ عام، اس کا فیضِ محیط، اس کی خبر گیری ہمہ گیر نظر آئی، اس نے میرے جوتے کی بھی خبر لی، اس نے میرے بال سنوارنے کا بھی سامان کیا، اس نے میرے ناخن تراشنے کے لیے بھی چیزیں دیں اور اسی کے ساتھ اس نے خود میری اصل ذات کے لیے جو کچھ بھی چاہیے تھا سب کچھ دیا، اور سیر چشمی کے ساتھ دیا، اہتمام کے ساتھ دیا: ''**وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا**'' ..... ''اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو گن نہیں سکتے۔''

اور یہی پیغام ان والا صفات، گرامی سمات، بے غرض مقدسین کا ہے جن کو ہم ''انبیاء علیہم

الصلوات والتسلیمات‘‘ کے مظہرِ عنوان سے یاد کرتے ہیں، صلوات اللّٰہ وسلامہٗ علیہم أجمعین ۔ کائنات کے اس سلسلہ کا ظہور کبھی نوح علیہ السلام، کبھی ابراہیم علیہ السلام، کبھی موسیٰ علیہ السلام یا اسی قسم کے دیگر برگزیدہ ارواحِ طیبہ کے ذریعہ سے ہوا اور اخیر میں وہ ایک نہایت مضبوط اور مستحکم اصولوں کے ساتھ بنی آدم کے فردِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ واصحابہ کے قلبِ قدوس سے بیابانِ فاراں میں قرآن کے فطرت آراء، بصیرت افروز شکل میں چہرہ پرداز ہوا، جیسا کہ خود اسی ’’نورِ مبین‘‘ کی روشنی میں ہم پڑھتے ہیں:

’’شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْ أَوْحَیْنَا إِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖ إِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی۔‘‘

’’تم لوگوں کے لیے وہ راہ خدا نے مقرر کی جس کی وصیت نوح کو کی گئی اور جس کو (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر اُتارا اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو کی۔‘‘

روحانی منافع کا یہ ذخیرہ‘ اصل حقیقت کے اعتبار سے ہمیشہ ایک رہا ہے، لیکن زمانہ کے تغیرات وتبدلات کے اعتبار سے اس میں بعض جزئی محاسن واوصاف کا اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ اس معدن میں جن جن چیزوں کا پیدا ہونا ضروری تھا سب پیدا ہوگئیں اور ہر حیثیت سے بنی آدم کے اولیٰ وادنیٰ کے لیے کافی ووافی، کامل واکمل ہوکر ایک اکمل ترین روح کے ذریعہ سے نسل آدم کو سونپ دیا گیا اور الحمد للہ! کہ وہ اپنے تمام محاسن وجمال کے ساتھ اس وقت تک موجود ہے، لیکن میں کہہ آیا ہوں کہ قدرت نے ہم کو جو کچھ بھی دیا ہے، محض مجمل دیا ہے، اصل شئے وہیں سے آئی ہے، خواہ روحانی ہو، یا مادی، باقی ان کی تشریح وتفصیل بھی انسانی کوششوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ باوجود اس بات کے کہ اسی زمین میں ہماری تمام ضرورتیں پوشیدہ اور مستور ہیں، لیکن ان ضرورتوں سے ہم اس وقت تک مستفید نہیں ہوسکتے جب تک کہ اس کے اندر غور نہ کریں، اپنی اِدراکی اور تفتیشی قوتوں کو اس کے اندر غرق نہ کریں۔

بجنسہٖ قرآن کا بھی یہی حال ہے کہ ظاہراً وہ بالکل ایک مختصر سی کتاب اور نہایت ہی مجمل سی چیز نظر آتی ہے، لیکن روحیں اسی میں ڈوبتی ہیں، گھستی ہیں، حتیٰ کہ جب نکلتی ہیں تو کوئی ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروق (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) ہوجاتا ہے، کوئی امام اعظم ابوحنیفہؒ بنتا ہے، کسی کو غوث اعظمؒ کا رُتبہ ملتا ہے، کوئی حجۃ الاسلام غزالیؒ اور کوئی مولائے معنویؒ کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔ اور میں تم کو کیا بتاؤں کہ کیا دیکھتا ہے اور دیکھ کر کیا بنتا ہے؟ وہ اس کے اندر جاکر کیا سمجھتا ہے اور پھر اس سے کیا نکالتا ہے؟ جو اس میں نہیں پڑا وہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے متعلق بہت کم اندازہ کرسکتا ہے۔

کم ازکم اسی مثال سے سمجھو کہ ظاہراً اس پانی میں تمہیں کیا بجلی نظر آتی ہے؟ لیکن جس نے غوطہ

لگایا اس نے اسی میں اس کو پایا۔ بہرحال میں نہایت تفصیل سے بتا آیا ہوں کہ مجمل مادہ میں ظاہراً کچھ نہیں، لیکن سوچنے والے وہ سب کچھ اسی سے نکال لیتے ہیں جن کا تعلق مادۂ انسانی سے ہے۔

پس اسی طرح گو تمہیں قرآن کے چند گنے گنائے اوراق میں شاید کوئی زیادہ اہمیت خیز شئے نظر نہ آئے، اگرچہ یوں بھی وہ کس کو بغیر تڑپائے چھوڑتا ہے، تاہم قرآن چونکہ قدرتی چیزوں میں سے ہے، اس لیے وہ کوشش اور سعی کو دعوت دیتا ہے، ہر شخص اپنی کوشش کی مقدار سے اس سے حصہ پائے گا، جس طرح مادہ کے اسرار میں بھی جو جتنی کاوش کرتا ہے پاتا ہے۔

قرآن کے اس قدرتی اجمال کی طرف جو ہر ایک قدرتی شئے میں بیّن طور پر نمایاں ہے، خود مہبطِ وحی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان لفظوں میں اشارہ فرمایا:

''**لاتشبع منه العلماء ولایخلق علٰی کثرة الرد ولاتنقضی عجائبهٗ**۔'' (رواہ الترمذی)

''اہلِ علم (دانش) اس سے (قرآن سے) کبھی سیر نہیں ہوسکتے، وہ کثرت سے بار بار دُہرانے کے بھی کبھی پرانا نہیں ہوسکتا، اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔''

دیکھو! ٹھیک جس طرح دنیا اس زمین کی پیداواروں سے کبھی سیر نہیں ہوسکتی، مادے کے ایک راز کے انکشاف کے بعد طبعاً متجسس طبائع دوسرے اسرار میں مشغول ہوجاتے ہیں اور کسی طرح اس سے نہیں گھبراتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے متعلق بھی یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ: اس سے علم کے متلاشی کبھی سیر نہیں ہوسکتے کہ اس کے ہر ناموس (راز) کے بعد دوسرا ناموس اپنی طرف بلاتا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ خدا جانے کتنے زمانہ سے انسان اس مٹی کو کُریدکُرید کر منافع حاصل کررہا ہے! ہر سال اسی زمین کو جوتتا ہے، اس میں دانے ڈالتا ہے، فصل کاٹتا ہے، لیکن پھر چند ہی مہینوں کے بعد اس کے ہل بیل اسی زمین پر موجود نظر آتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ باوجود اس اُلٹ پھیر کے یہ زمین کسی طرح پرانی نہیں ہوتی۔ ٹھیک یہی قرآن کے متعلق ارشادِ نبوی ہے کہ یہ جتنی دفعہ دُہرایا جائے گا پرانا نہیں ہوگا، اور ہمیشہ نئی فصل اس سے ہاتھ لگتی رہے گی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا: ''**نعم الحال المرتحل**''.... ''کیا اچھا ہے وہ شخص جو اُترنے کے بعد پھر سوار ہوجاتا ہے۔'' (یعنی) قرآن ختم کرنے کے بعد پھر شروع کردیتا ہے۔

پھر دیکھو! مادہ کے عجائبات مادی ضرورتوں کے لیے کبھی ختم نہیں ہوسکتے، نت نئی چیزیں اس سے روزانہ اُبل رہی ہیں، پس وہ چیز جو روح ہے اس کے عجائبات بھی روحانی منافع کے باب میں کبھی ختم نہیں ہوسکتے، جیسا کہ ابھی ارشادِ نبوی میں گزر چکا، اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔ اور یہی نہیں، اس قدرتی مادے کے حالات وکوائف، خصائص واوصاف پر ہم جہاں تک غور کرتے ہیں، اسی سے اس قدرتی روح کی بھی شرح ہوتی چلی جاتی ہے، تم دیکھتے ہو کہ کبھی کبھی اس مادی کائنات کے بعض

اجزاء میں سخت بے ربطی نظر آتی ہے، مثلاً: ایک مدت تک یہ دیکھا جاتا تھا کہ سمندر میں جزر و مد‘ چاند کے زوال وکمال کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، لیکن اسرارِ مادی کے تلاش کرنے والوں پر بالکل نہیں کھلتا تھا کہ آخر ان دونوں میں کیا ربط ہے؟! حتیٰ کہ سوچنے اور غور کرنے کے بعد آخر یہ راز فاش ہوگیا اور عام طور سے مشہور ہے۔ اسی طرح بارش، آفتاب، مون سون، سمندر، ان چیزوں میں مدتوں بے ربطی نظر آتی رہی، لیکن اب سمجھا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ مضبوط ربط اور کسی چیز میں بھی نہیں۔ اور اسی پر کیا موقوف ہے بعض مسخروں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ میاں نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کو کوٹھی میں بھر کر فضائے آسمانی میں چھڑک دیا کہ ان میں کوئی نظام نہیں ہے، لیکن علم النجوم کے ماہرین سے جا کر پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ کیا اس سے زیادہ مرتب نظام وہ کہیں اور پاتے ہیں؟!

ٹھیک اسی طرح ہم کبھی کبھی ’’روحانی کائنات‘‘ (قرآن) کے بعض اجزاء میں سخت بے ربطی محسوس کرتے ہیں اور چونکہ اس کو مصنوعی کلام پر قیاس کیا جاتا ہے، اس لیے بسا اوقات کوئی ربط پیدا بھی نہیں ہوتا، لیکن احبارِ اسلام جو قرآن کو انسانی کلام پر نہیں، بلکہ اسی جیسی دوسری کائنات پر قیاس کرتے ہیں تو ان کے سامنے تمام اسرار اسی ربط کے دریافت کرنے میں مستور نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ جس طرح آج کائناتِ مادی کی بنیاد وحدت پر قائم کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ گو بادی النظر میں یہ تمام چیزیں جدا جدا نظر آتی ہیں، لیکن واقع میں یہ سب ایک ہی زنجیر میں جکڑی ہوتی ہیں، یہ دعویٰ علماء قرآن کا بھی ہے۔ مادہ کا متلاشی کہتا ہے کہ ہمارا سارا فلسفہ یہی ہے کہ مادی موجودات کے باہمی ربط کو دریافت کرلیں، اسی طرح روح کا متجسس کہتا ہے کہ ہمارا سارا عالم یہی ہے کہ ’’روحانی موجودات‘‘ یعنی آیاتِ قرآنی کے باہمی ربط کا پتہ چلالیں۔

بہرحال ان کا دعویٰ یہی ہے کہ قرآن کوئی انسانی تالیف اور بشری صناعت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک قدرتی حقیقت ہے، پس اُسے ہمیشہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے اور قدرتی چیزیں دیکھی جاتی ہیں، اس کو اُسی طرح پڑھنا چاہیے جس طرح ہم اس مادی صحیفۂ فطرت کو پڑھتے ہیں، اس کی ہر آیت کو ایک مستقل موجود اسی طرح قرار دینا چاہیے جس طرح اس مادی کائنات کے ہر موجود کو قرار دیا گیا ہے اور جس طرح مادی کائنات کے خاص خاص موجود کے لیے خاص خاص علم بنائے گئے ہیں، مثلاً: درخت کے لیے ایک خاص علم ہے، پانی کا ایک خاص فن ہے، الیٰ غیر ذلک، اسی طرح قرآن کی ہر آیت بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کے ماننے والے اس کی ہر آیت کے لیے ایک مستقل فن بنائیں اور اسی طرح ہم ’’روحانی کائنات‘‘ کے فوائد سے اسی طرح متمتع ہوسکتے ہیں جس طرح ’’مادی کائنات‘‘ کے منافع سے فائدہ اُٹھارہے ہیں، وہ ایک مستقل علم ہے، اور اسی لیے قرآن کے لیے ان تمام لوازم کی جستجو کرنی چاہیے جن کی تلاش ہم مادی علم میں کرتے ہیں، حتیٰ کہ اسی بنیاد پر بلاکسی خوفِ تردید کے یہ کہا

جا سکتا ہے کہ جس طرح اس مادی عالم کے بعض اجزاء سے ہمارے جسدِ استخوانی کو کبھی کبھی نقصان پہنچ جاتا ہے، ٹھیک یہی حال ''روحانی کائنات'' کی ہستیوں کا ہے، ایسا ہوتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اسی کے بعض اجزاء سے بجائے کسی نفع کے حقیقتِ انسانیہ وروح کو ضرر اور ضررِ عظیم پہنچ جاتا ہے، اس کی طرف خود قرآن نے بھی اشارہ کیا: ''يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا''..... ''اسی قرآن سے بہت سی (روحوں) کو خدا گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو سیدھی راہ پر لے چلتا ہے۔''

لیکن العیاذ باللہ! اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان اجزاء اور آیتوں کو خداوندِ رحمٰن نے ضرر پہنچانے کے لیے اُتارا ہے، کیونکہ اس کا امکان ''روحانی کائنات'' میں تو خیر اس ''مادی کائنات'' میں بھی نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ اس عالم میں ہو یا اُس عالم میں اصل ذات کے اعتبار سے نہ کوئی چیز بے کار ہے اور نہ مضر، لیکن اسی کے ساتھ ہر چیز کے استعمال کا ایک قانون اور خاص طریقہ ہے، مثلاً: فرض کرو کہ اس عالم میں اُپلے بھی ہیں، گیہوں بھی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بے کار مضر ہے؟! لیکن فرض کرو کہ کسی نے اُپلے کو رکابی میں چور کر کھانا شروع کیا، اور گیہوں کو ایندھن میں جھونک دیا تو یہ قصور نہ اُپلے کا ہوگا اور نہ گیہوں کا، بلکہ یہ طریقۂ استعمال کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور یہ تو ایک مثال ہے، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو ہر چیز کے استعمال کا طریقہ معلوم ہے، ان کے نزدیک اس عالم کی کوئی چیز نہ بے کار ہے اور نہ مضر، وہ سب ہی کو مفید سمجھتے ہیں اور حسبِ استطاعت ہر ایک سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

پس قرآنی کائنات (آیات) سے اگر بجائے ہدایت کے کسی میں ضلالت کے جراثیم پیدا ہوں تو اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ اس آیت کا قصور نہیں ہے، بلکہ اس احمق کی جہالت اور علمی سرکشی کا نتیجہ ہے؟! خود مُنزلِ قرآن جل وعلا شانہٗ نے اس کی تصریح ان لفظوں میں فرمائی: ''وَمَا يُضِلُّ بِهٖ إِلَّا الْفَاسِقِيْنَ''....... ''اور قرآن سے خدا انہیں گمراہ کرتا مگر محض فاسقوں کو۔''

جو اس روحانی کائنات کے طریقۂ استعمال اور قانونِ تناسب سے واقف نہیں ہے اور وہ ان فطرتی حدود کو جو ہر ایک آیت کے استعمال کے لیے مقرر ہیں پروا نہیں کرتا، اسی کو ''فاسق'' کہتے ہیں۔ اس لیے اگر نادانوں کو قرآن سے کوئی نقصان پہنچا تو یہ ان کے ہی نقص کا خمیازہ ہے: ''وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهٖ'' اور یہی نہیں بلکہ تم دیکھتے ہو کہ کبھی کبھی ہمارا ہیکلِ جسمانی کچھ اس طرح مریض ہو جاتا ہے کہ مادی عالم کا ہر جزء اور اس کی ہر ایک چیز جسم کے لیے مضر ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ دنیا کی مفید سے مفید چیزیں ایسے وقت میں انسانی جسد کے لیے زہرِ قاتل کا کام انجام دیتی ہیں۔

ٹھیک یہی حال اس ''عالمِ روح'' کا بھی ہے کہ کبھی نہ صرف اس کی بعض آیتیں، بلکہ مسلم قرآن ان لوگوں کے حق میں سمِ قاتل ہو جاتا ہے جنہوں نے اپنی روحانی صحت برباد کر لی ہے، اس

مسئلہ کو خود قرآن نے واضح کیا ہے:

’’وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ إِيْمَانًا، فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ، وَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كَافِرُوْنَ۔‘‘

’’اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے تو ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم میں سے کس کس کے اندر اس سورت نے ایمانی قوت کا اضافہ کیا؟ پس ایمان والوں کا تو یہ حال ہے کہ ان کے ایمان میں اس سے بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور اپنی اس (روحانی مسرت) پر ایک دوسرے کو خوشی کا پیغام سناتے ہیں، مگر وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے تو پھر بھی سورت ان کی نجاست پر نجاست کا اضافہ کرتی ہے، وہ مرجاتے ہیں اور کافر مرجاتے ہیں۔‘‘

بہرحال آیاتِ قرآنی سے اگر کسی کی نجاست پر نجاست کا اضافہ ہوتا ہو تو اس میں قصور اس شخص کا ہے جس نے حدود اللہ کی حفاظت نہ کی، اور ہر طرح کے خیالات کو بغیر کسی آئین وقانون کے اپنے اندر اُتارتا چلا گیا، حتیٰ کہ ان ہی بے اعتدالیوں نے آخر اس کی صحت برباد کردی اور جس کی صحت خراب ہوجاتی ہے کیا شبہ ہے کہ اس کے حق میں اعلیٰ سے اعلیٰ، مفید سے مفید چیزیں بھی بد سے بدتر ہوجاتی ہیں! اور اسی لیے دونوں عالم کے موجودات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ انسان کے اندر صحیح اور سچی قوتِ ممیّزہ ہو اور پھر ہر موجود کے طریقۂ استعمال سے بھی واقف ہو۔ ممکن ہے کہ بعضوں میں یہ قوتِ تمیزی فطری طور پر موجود ہو، لیکن اکثر افرادِ انسانی اس کے لیے اکتساب وتعلیم کی طرف محتاج ہیں، خواہ کسی مدرسہ میں ہو یا جاننے والوں کی محض صحبت میں، خصوصاً ’’روحانی کائنات‘‘ کی چیزیں چونکہ بہت زیادہ لطیف اور بہت زیادہ دقیق ونازک ہیں، اس لیے اس کے حدود ومنازل اور طرقِ استعمال کے لیے روحانی بصیرت اور دلی تنوُّر کی ضرورت ہے، جو بغیر کسب وریاضت کے مشکل ہی سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

اسرار وحقائق کا یہی پاک سلسلہ ہے جو درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا اخیر میں اسلام کے اس طائفہ منصورہ (جس کی نصرت اللہ کا کلام قرآن کرتا ہو) کے یہاں علیٰ وجہ الکمال بے نقاب ہوجاتا ہے، جن کو ہم ’’صوفیاء کرام اور اولیاء اللہ‘‘ کہتے ہیں اور خاص اصطلاح میں ان کا سچا نام ’’صدیقین‘‘ ہے، رضی اللّٰہ تعالٰی عنهم ورضوا عنه، کثر اللّٰہ وجودهم فی الإسلام والمسلمین فإنهم دعائم الدین وأرکانهٗ ۔

اَخیر میں مجھے اسی ’’روحانی کائنات‘‘ کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے، فرض کرو کہ کوئی احمق یہ ارادہ کرتا ہے کہ ہم اپنے مادی شکم کو بغیر اعانتِ مادہ کے بھرلیں گے تو اس کا آخری حشر بجز موت کے اور کیا ہوسکتا ہے؟! حالانکہ اس مادہ کی طرف خود وہ نہیں، بلکہ اس کا ہیکلِ چرمی محتاج ہے، جو ممکن ہے کہ روح کے قوی کرنے سے کچھ دن اس کا ساتھ دے سکے۔

اسی طرح قرآن کے متعلق بھی سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا:

''ومن ابتغی الهدی في غيره أضله اللّٰه۔''

''جو شخص قرآن کے سوا اور کسی چیز میں ہدایت کی جستجو کرتا ہے خدا اُسے بھٹکا دے گا۔''

بلاشبہ جب مادی جسم مادہ سے مستغنی نہیں ہوسکتا اور اس کی بقاء کے لیے ہر وقت اجزاء مادیہ کی ضرورت ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک انسان جس کی اصل ذات ''روح'' ہے، وہ بغیر روحِ قرآنی کے اپنی اصلی زندگی کو قائم رکھ سکتا ہے یا اس کو کسی اور چیز سے حاصل کرسکتا ہے؟ یہ گمراہی سرکشوں کو ابھی نہیں معلوم ہوتی، لیکن جب روح کی راہوں کی تلاش کا وقت آئے گا اس وقت یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہوجائے گی۔ جو برسات میں اپنی کاشت کا انتظام نہیں کررہا ہے تو اُسے چھوڑ دو، فصل کٹنے کے وقت اپنی حماقت پر خون کے آنسو روئے۔

علی الخصوص مجھے اس قوم تک یہ خبر ضرور پہنچا دینی چاہیے، جس نے قرآن کی حفاظت ونگرانی، عمل واستعمال کا عہد باندھا ہے کہ اس کے لیے تو شاید آنے والے دن کا بھی انتظار کرنا نہ پڑے اور قبل اس دن کے وہ اسی زمین پر تباہ وبرباد ہوجائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد ارشاد فرمایا تھا:

''من ترکهٗ من جبار قصمه اللّٰه''

''اور جو جبر وعناد کی وجہ سے قرآن کو چھوڑ دے گا، خدا اُسے توڑ دے گا۔''

دنیا کی اگر دوسری قومیں اس ''روحِ عرشی'' کی قدر وعزت نہیں کرتیں تو زیادہ تر اس کی وجہ جبر وعناد نہیں ہے، بلکہ جہل ولاعلمی ہے، پھر وہ قوم جو یہ یقین کرتی ہے کہ یہ ''کائنات'' بھی اس کی نازل کی ہوئی ہے، جس نے ''مادی کائنات'' کو پیدا فرمایا اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے علاوہ روحانی ہدایت اور کہیں نہیں مل سکتی، اس کے بعد وہ جس بری طرح اس سے اعراض کررہی ہے تو اس کی علت بجز ''جباریت'' کے اور کیا قرار دی جائے؟

مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اُنہوں نے قرآن کو چھوڑا، خداوندِ قدوس نے ان کو وہیں توڑ دیا۔ اندلس میں قرآن ماننے والی قوم جاتی ہے، رہتی ہے، کھاتی ہے، پیتی ہے، کچھ دن اس کا اشتغال قرآن کے ساتھ رہتا ہے، لیکن یکا یک اس کا خیال بدل جاتا ہے اور ارسطو کا فلسفہ، بطلیموس کی ریاضی اُسے پاگل بنا دیتی ہے، قرآن کی عظمت اس کے دل سے جاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اخیر میں اس کا مشغلہ فلسفہ اور ادب کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ سچی پیشگوئی کہ جس نے جبر وعناد کے ساتھ قرآن کو چھوڑا، خدا اُسے توڑ دیتا ہے' ان پر صادق آجاتی ہے:

''فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا۔''

''(وہاں جا کر دیکھ آؤ) یہ ان کے مکانات ہیں، جو ان کے بعد زیادہ دن تک آباد نہ رہ سکے۔''

دجلہ کے کنارے یہی قرآن پڑھنے والی قوم آئی بھی اور مدتوں رہی، لیکن رفتہ رفتہ قرآن سے اس کا تعلق کمزور ہوتا گیا، حتیٰ کہ جب یونانی فلسفہ نے نصیر الدین طوسی اور علامہ سمرقندی جیسے لوگوں کو پیدا کیا اور قرآن سے اس قوم کا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا تو تم نے دیکھا کہ خدا نے بھی ان کو کس طرح توڑ دیا؟

''أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ۔''

''ان پر ہمارا حکم رات یا دن کو آگیا، پھر ہم نے ان کو کاٹ کر رکھ دیا اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل گویا آباد ہی نہ تھی۔''

تم نے سنا ہوگا کہ اسی قوم کا ایک جرگہ، جمنا کے ساحل پر بھی خیمہ زن ہوا تھا، اس نے اس کے کنارے بڑی بڑی عمارتیں بنائیں اور مدتوں آرام کیا، حتیٰ کہ اسی جرگہ کا ایک بادشاہ تھا اور اس نے قرآن کو محض اپنے جبر اور استکبار کے ساتھ چھوڑا، اس نے ہدایت کی تلاش قرآن کے علاوہ اور دوسری چیزوں میں شروع کی، حتیٰ کہ اس کے دربار میں بجز شعر وشاعری، دماغی عیاشی کے اور کچھ نہ رہا، قرآن کو اس زمانہ میں کسی نے چھوا بھی تو فقط اس لیے کہ اپنا زورِ قلم دکھائے، عربی لغت میں جو اس نے عبور حاصل کیا تھا اس کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرے، پھر کیا حال ہوا اس قوم کا؟ تم کو میں کیا بتاؤں؟ جاؤ! دلی کے کھنڈروں کی زبانی اس افسانہ کو سنو، آگرہ کے در و دیوار سے اس کا قصہ پوچھو!

اللہ اللہ! کتنا دردناک منظر تھا؟ اس قرآن پر ایمان لانے والی قوم کا کہ اسی بادشاہ کے پوتوں اور پروتوں نے یہ فیصلہ دیا کہ قرآنی تعلیم بت پرستوں کی مفروضہ کتابوں سے ماخوذ ہے، مذہبی مدارس وتعلیم گاہوں میں بھی بجز ہیولیٰ اور صورتِ جسمیہ کے اور کسی کا تذکرہ باقی نہ رہا، قرآن درس سے خارج تھا، حدیث وآثار پڑھنے کی چیز نہ سمجھی گئی، سنبھالنے والوں نے سنبھالنا چاہا، لیکن پانی سر سے گزر گیا تھا اور خدا کی بات پوری ہونی تھی:

''فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا۔''

''پھر چھا گیا اُن کا خدا اُن پر اُن کے گناہوں کی وجہ سے اور اُن کو برابر کر دیا۔''

حتیٰ کہ تختِ طاؤس کا وارث عالم غربت میں بصد بے نوائی وکس مپرسی ایک سمندر کے کنارے گوڈر میں لپیٹ کر دفن کر دیا گیا اور یہ تھا اس بدبخت قوم کا آخری انجام، جس نے خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر انسانی خیالات کی پیروی شروع کی۔ (۱)

حاشیہ:۱...... یہ اشارات ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اندلسی مسلمانوں کی دماغی روش کا اندازہ حضرت شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے مل سکتا ہے کہ وہ قرآنی حقائق کو فلسفی اصطلاحوں میں سمجھانے پر مجبور ہیں، کیونکہ ان کی مخاطب قوم فلسفہ کے علاوہ اور کسی چیز سے متاثر نہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ دولتِ عباسیہ کے ایامِ انحطاط میں اپنی تفسیر لکھتے ہیں اور طبیعیات والٰہیات، ریاضیات سب ہی کو اس میں بھر دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں کلام کے اندر وَزن بغیر اس کے پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان کے مصلح اعظم شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مکتوبات میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے آدمی سمجھ سکتا ہے کہ ہندی مسلمانوں کے اعمال واخلاق کا کیا حال تھا۔

ایک افسوس ناک مغالطہ جس میں یہ قوم مبتلا ہوئی، وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے کو دوسری قوموں پر قیاس کیا، وہ اپنی زندگی کے قوانین کا استنباط بجائے آسمانی ہدایت کے غیر قوموں کی تاریخ سے کرنے لگی، حتیٰ کہ اسی بنیاد پر کسی نے اس کو مشورہ دیا کہ وراثت کا قانون چھوڑ و، ورنہ مر جاؤ گے، حال ہی میں ایک نیک نیت آدمی نے اپنی زبوں حالیوں کو دیکھ کر ایک عام آواز دی کہ مسلمانو! سود کھاؤ، تمہارے تنزل کا اصلی راز فقط یہی ہے کہ تم نے شیرِ مادر کی طرح سود کے گھونٹ کو حلق میں نہیں اُتارا ہے، **إلٰی غیر ذلک من المشاورات۔**

حالانکہ میں سچ کہتا ہوں اور مجھ پر یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ اس قوم کا قانونِ حیات ان اقوام سے بالکل جدا ہے، جنہوں نے خدا کے آخری عہد کو ابھی قبول نہیں کیا ہے، ان کے نزدیک بجز ''کائناتِ مادی'' کے اور کسی ''کائنات'' کا راز واضح نہیں ہوا ہے، وہ جنہوں نے خدا کے اس آخری پیغام کو ابھی نہیں تسلیم کیا ہے، ان میں سے ابھی بکثرت ایسے ہیں جن کے ساتھ خدا کا ٹھیک وہی تعلق ہے جو زمین پر بسنے والے دوسرے جانوروں، چوپاؤں، درندوں، پرندوں کے ساتھ ہے، پس دوسرے اگر ''کائناتِ روحانی'' سے اعراض کر کے صرف ''مادی کائنات'' میں مشغول ہیں تو خداوندِ رحمٰن ان کو اسی طرح کھلائے گا، پلائے گا، جس طرح اپنی چڑیوں اور اپنے بندروں اور چوپاؤں کو کھلاتا ہے۔

ہمالہ کا بندر اب بھی سرسبز درختوں کی ٹہنیوں پر آزادی سے اچھلتا ہے، اس کے پھلوں اور میووں کو سیر ہو کر کھاتا ہے اور ٹھنڈے چشموں کے پانی سے دل وجگر کو سیراب رکھتا ہے، خدا کے پرندوں کو دیکھو! کتنی نشاط کے ساتھ طاؤسِ دم کھول کر جنگلوں میں ناچتا ہے اور چڑیاں جھوم جھوم کر شاخوں پر گاتی ہیں، چہچہاتی ہیں، بہرحال ان تمام جانوروں میں سے کون ہے جس کو مناسب غذا، عمدہ ہوا، اور اچھا پانی میسر نہیں؟ لیکن جس قوم نے ''کائناتِ روحانی'' کے آخری ظہور و بروز کو پہچانا اور اسی کی روشنی میں چلنے کا عہد کیا، پھر باوجود اس علم ویقین کے محض جبر وعناد، تکاسل وتہاون کی وجہ سے اس کو چھوڑا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ خدا کا غصہ ان پر تھم جاتا، پیشگوئی پوری ہوئی اور صاف نظر آ گیا کہ جس قوم نے جاننے اور پہچاننے کے بعد ''روحانی کائنات'' کو چھوڑا، خدا بھی اُسے اپنی ''مادی کائنات'' سے دھکیل رہا ہے اور وہ تو دھکیل بھی چکا۔

ہم نے ٹیگس ودجلہ، جمنا پر آنسو بہایا، پھر اسی جرم میں کیا باسفورس اور نیل کی وادی میں رہنے والوں پر اعتراض نہ کیا جائے گا؟ پہلوں نے یونان وہند کے دماغی سیلاب کے ساتھ اپنے کو تباہ کیا اور پچھلوں نے برفستانِ یورپ کی طغیانیوں میں اپنے کو غرق کیا، یہ کہا جائے گا اور قطعاً کہا جائے گا، میری یہی تحریر (سیلِ راہ بنے گی) آنے والی نسلیں اسی سے استدلال کریں گی۔

کہا جاتا ہے کہ ''قرآن کو تھامو!'' ایک عام آواز ہے، جو ہمیشہ مذہبی جماعت کی طرف سے

مسلمانوں کے گھرانوں میں گونجتی رہی ہے، خصوصاً اس عہدِ انحطاط وزوال میں تو واعظوں اور منادیوں نے اس جملہ کو اپنا سخن تکیہ بنالیا ہے، جو آتا ہے یہی کہتا ہے، حالانکہ مسلمانوں کی جس جماعت میں قرآن کی درس وتدریس، شرح وتفسیر کا سلسلہ جاری ہے، اس کی اخروی حالت کے متعلق تو کیا کہا جائے کہ وہ پیش نظر نہیں، لیکن دنیاوی حیثیت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ ''کائناتِ مادی'' کا دروازہ جس قوم پر بند ہے، وہ یہی قوم ہے۔ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل وخوار قوم ہے اور اس میں سب سے زیادہ خراب حالت مولویوں کی ہے۔

یقیناً یہ صحیح ہے اور اس کو یوں ہی ہونا چاہیے، اس لیے کہ قرآن کے تھامنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ اس کا ترجمہ اور معنی سمجھ لیا جائے۔ قرآن کے معانی ومطالب سے تو ابوجہل بھی واقف تھا، پھر کیا اس علم نے اس کو کچھ بھی فائدہ پہنچایا؟ یقیناً قرآن کے محاورات وادبی نکات کو جتنا وہ سمجھتا ہوگا، ہندوستان کا ایک مولوی اتنا نہیں سمجھ سکتا، پھر بھی اس کا خطاب ''ابوجہل'' کیوں ہوا؟

بلکہ اس ترجمہ کا جاننا ان کے لیے اور بھی وبالِ جان ہوجاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ خداوندِ قدوس کا مواخذہ عموماً تبلیغ کی شدت وضعف کے ساتھ وابستہ ہے، جس کو جس درجہ کی تبلیغ ہوئی ہے اس کا مواخذہ بھی اسی درجہ کا ہوتا ہے، کسی نے سچ کہا ہے:

وإن كنت لاتدری فتلك مصيبة وإن كنت تدری فالمصيبة أعظم

پس معنی کے جاننے والے مسلمان جن کو ہم علماء کہتے ہیں، یقیناً باعتبارِ تبلیغ کے ان کا رُتبہ عام مسلمانوں سے بلند ہے اور اسی لیے اگر خدا کی گرفت ان کے ساتھ سخت ہے تو یہ خدا کی سنت ہے: ''وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ''اور میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ قرآن کے پڑھنے والوں میں ایسے بکثرت ہیں جن کی عملی حالت عام مسلمانوں سے بہت کم ممتاز ہوتی ہے اور جو کچھ ہوتی ہے وہ بھی قرآن کے اَثر سے نہیں، بلکہ اپنے شکم کے اثر سے، وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم ان باتوں کو بھی چھوڑ دیں گے تو پیٹ کی پیاس پھر کسی طرح بھی بجھ نہیں سکتی۔

میری یہ گفتگو بہتوں پر گراں گزرے گی، حتیٰ کہ خود مجھ پر گراں گزر رہی ہے، میرا نفس بھی اس حقیقت پر پَردہ ڈالنا چاہتا ہے، لیکن ''بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَلَوْ أَلْقٰى مَعَا ذِيْرَهٗ ''اور میں نے زیادہ تر اسی کے علی الرغم ان خیالات کو ظاہر کردیا ہے، بہرحال درمیان میں ایک شبہ اور بھی آجاتا ہے، اس کو بھی صاف کرلیا جائے، پھر آئندہ جو کچھ کہلایا جائے گا' کہوں گا۔

شبہ یہ ہے کہ میں نے گویا دنیاوی فراغ بالی اور افلاس کو خدا کی رضا اور عدم رضا کی علامت قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح آثار واحادیث ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے غریب وفقیر، محتاج ونادار ایسے ہیں جو گو دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہوں، لیکن خدا کی نگاہ میں ان کی عزت ہوتی

ہے، خود قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کفار ان کی ناداری کی وجہ سے ''أَذَلُّ'' اور ''أَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّأْیِ''، وغیرہ کہتے تھے، اسلام میں ایسے اکابر اولیاء اللہ بکثرت گزرے ہیں جو دنیاوی حیثیت سے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔

بلاشبہ ایسا ہی ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں، لیکن یہاں پر ایک نکتہ قابلِ لحاظ ضرور ہے کہ اس سلسلہ میں اشخاص وقوم دونوں کے حالات مختلف ہیں، یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خدا کے نزدیک مقرب ومعزز ہو، آخرت میں اس کے بڑے درجات ہوں، لیکن باری عز اسمہٗ نے خاص حالات (۱) کے اعتبار سے اس کے رزق کو محدود کردیا ہو، لیکن قومی نکبت وفلاکت کی حیثیت اور ہے، قرآن مجید نے کثرت سے اس مسکنت اور خواری کو عتابِ آسمانی سے تعبیر کیا ہے، مثلاً فرعون کی قوم کے متعلق ارشاد ہے:

''کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ وَّنَعْمَۃٍ کَانُوْا فِیْھَا فَاکِھِیْنَ کَذٰلِکَ وَأَوْرَثْنَاھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ۔''

''کتنے باغ اور کتنے سرچشمے اور کتنے کھیت اور کتنے باعزت مقام اور کتنی نعمتیں جس میں خوشی کے ساتھ زندگی بسر کررہے تھے، چھوڑ بیٹھے اور یوں ہی ہوتا ہے، اس کے بعد ہم نے دوسری قوم کو وارث بنادیا۔''

یا یہود کے متعلق مختلف مقامات میں ارشاد ہے کہ: ''ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ'' إلٰی غیر ذٰلک من الآیات۔ پھر بتاؤ! کہ اگر میں آج اس قوم کے متعلق جو یلدیز وسرائے باغیچہ کو چھوڑنے پر مجبور ہے یا اس سے پہلے قلعہ معلٰی اور اعتماد الدولہ کے فلک نما ایوانوں سے نکالے گئے یا قصرِ حمراء زہراء سے اُنہیں دھکیل دیا گیا، اس کو عتابِ الٰہی نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں؟

شخصی افلاس کا اثر مرکزِ قومیت اور قوامِ ملّت پر نہیں پڑتا اور اس قوم کے اصل مقصد کو اس سے کوئی گزند نہیں پہنچتا، لیکن قومی مسکنت جڑ ہلادیتی ہے اور جن مقاصد واغراض کے لیے اس قوم کا وجود پیدا کیا جاتا ہے، وہ سب اس کے بعد خاک میں مل جاتے ہیں، وہ آگے چل کر اُٹھنا بھی چاہتی ہے تو اُٹھ نہیں سکتی، اس کی ساری قوتیں اس مصیبت کے بعد گم ہوجاتی ہیں، بخلاف اس کے کہ کسی قوم کے کچھ لوگ فقیر ومسکین ہیں کہ اس کا اثر قومیت کی مضبوط چٹان تک نہیں پہنچتا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو ایسے فقراء ومساکین سے نظامِ ملت میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور کسی گھر کے بننے اور کسی کے بگڑنے سے دولت کی حرارت بہت کچھ نقطۂ اعتدال سے قریب رہتی ہے، واللہ اعلم بالصواب!

حاشیہ: ۱:...... ان خصوصیات کا استیعاب بہت مشکل ہے، کبھی رفعِ مراتب کے لیے ایسا ہوتا ہے، کبھی بعضوں کی نفسی شرارتوں کو توڑنے کے لیے بطور علاج کے ایسا کیا جاتا ہے۔ حدیثوں سے ان چیزوں کا پتہ چلتا ہے اور خود قرآن بھی اس کی طرف اشارہ فرماتا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

بہر حال میرا خیال یہ ضرور ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے خدا کی ''روحانی کائنات'' کو سمجھنے اور ماننے کے بعد چھوڑ دیا ہے، اسی لیے خدا آج اُنہیں ''مادی کائنات'' سے محروم فرمارہا ہے اور یہ عقیدہ دل میں قرآن ہی سے پیدا ہوا ہے، مثلاً سورۂ ہود میں ارشاد ہے:

''الٓرٰ كِتٰبٌ أُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّا اللّٰهَ إِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ وَأَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ۔''

''(قرآن حکیم) ایک کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط واستوار کی گئی ہیں اور پھر جاننے والے دانشمند خدا نے اس کی تفصیل کی یہ کہ نہ پوجو لیکن ایک ہی خدا کو، میں تم کو اس خدا سے ڈرانے والا اور مژدہ سنانے والا ہوں اور یہ کہ گناہ اپنے پروردگار سے بخشواؤ اور اسی کی طرف پل پڑو، تم کو دے گا اچھے فوائد ایک خاص وقت تک (یعنی دنیا) میں دے گا اور ہر شخص کو اس کی حیثیت کے موافق عطا فرمائے گا۔''

اس لیے ضرورت ہے کہ اگر ہم پھر زندہ ہونا چاہتے ہیں تو خدا کے ''عالم روح'' کو پہچانیں، نہ اس طرح جس طرح کہ ابوجہل نے جانا، کہ ایسا جاننا' جہل سے زیادہ کوئی رُتبہ نہیں رکھتا، بلکہ وہ جاننا جس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم راوی ہیں:

''عن ابن مسعودؓ: كنا إذا تعلمنا من النبي ﷺ عشر آيات من القرآن لم نتعلم العشرَ التي بعدها حتى نعمل مافيه۔''

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ: ہم لوگ پیغمبر خدا ﷺ سے جب قرآن کی دس آیتیں سیکھتے تھے تو اس کے بعد دس نہیں سیکھتے جب تک اس پر عمل نہیں کر لیتے۔''

پس اب بھی قرآن کی تعلیم کا یہی طریقہ ہونا چاہیے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین گویا ہر آیت پر عمل کرتے تھے، حالانکہ قرآن مجید میں عملی چیزیں تو بہت ہی کم ہیں، اس میں زیادہ حصہ تو خدا کی تعریف اور اس کی شان وشوکت کا ہے، پھر قصص وامثال ہیں، اس کے بعد جنت ودوزخ کا تذکرہ ہے اور سب سے کم جو چیزیں قرآن میں ہیں وہ اعمال ہیں، مثلاً: نماز، روزہ کو قرآن نے بیان کیا ہے، مگر وہ بھی محض اجمالی طریقے سے، پھر قرآن کی ہر آیت پر عمل کرنے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں؟

یہ سوال ہے اور بہت بڑا سوال ہے، ہم کو سوچنا چاہیے کہ قرآن کی ہر آیت عملی قالب کس طرح اختیار کرسکتی ہے؟ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقِ عمل کیا تھا؟ اور کیا کہیں مسلمانوں کی ساری

خرابیوں کا راز اسی میں تو پوشیدہ نہیں؟ حتیٰ کہ ان میں سے کبھی ایک نیک دل آدمی اُٹھتا ہے، اس ولولہ کو لے کر اُٹھتا ہے کہ قرآن میں جو کچھ چیزیں ملیں گی اس پر عمل کرتا جائے گا، لیکن اس کی مایوسی کی کوئی انتہاء نہیں رہتی، جب کہ پاروں اور منزلوں کے بعد بھی اس کے سامنے عملی حکم کی کوئی آیت نہیں آتی، یا آتی ہے تو بہت زیادہ مجمل ومختصر اور اس کے بعد اس کا دل بیٹھ جاتا ہے، اخیر میں یہ سمجھ لیتا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت ثواب ہے، پڑھنا چاہیے، خواہ کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔

لیکن اصل یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مسلمانوں نے عمل کے معنی میں ترمیم کر لی ہے اور عموماً اس کا اطلاق محض ان افعال پر ہوتا ہے جن کا تعلق ظاہر جسم ہے، یا اگر کبھی کسی نے کچھ دقتِ نظر ہی سے کام لیا تو اس کے تحت میں نفسانی اخلاق کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے، مثلاً: عموماً عمل کے یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ نماز، روزہ صدقہ، وخیرات وغیرہ کرنا چاہیے۔ جو زیادہ بالغ النظر ہیں وہ اس میں اور اضافہ کرتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، عیب سے رُکنا چاہیے، اس سے بھی اگر آگے نظر گئی تو کہا جاتا ہے کہ حسد نہیں کرنا چاہیے، بخل سے نجات حاصل کرنا چاہیے اور جہاں تک میرا خیال ہے، موجودہ وقت میں عموماً عمل کا دائرہ اسی سلسلہ پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن مندرجہ بالا اثر میں عمل کو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ معنی میں استعمال کیا گیا ہے، عمل کے اس اطلاق میں سب سے پہلا عملی کام یہ ہے کہ صحیح علم کے ذریعہ سے باطل علم کو تباہ کیا جائے، حق سے باطل کو ہمیشہ برباد کرنے میں مشغول رہنا چاہیے، یہ عمل کوئی جسمانی فعل یا دماغی قوت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، بلکہ اس کا میدان عالم جسم سے بہت آگے ایک اور عالم ہے جس کا آسمان بھی روحانی ہے اور زمین بھی روحانی ہے، وہاں صرف روح ہے اور اس کی فضا میں علاوہ روحانیات کے اور کسی چیز کا گزر نہیں، پس جو ''روحانی کائنات'' سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے، وہ ان اجمالی تخموں (بیجوں) کو مادی زمین کے کسی حصہ پر نہ چھڑکے کہ یہاں اس سے کوئی بہتر نتیجہ نہیں پیدا ہو سکتا، بلکہ براہِ راست ان کو روح کی زمین میں بوئے۔

پھر دیکھئے کہ اس عالم میں کیسے سرسبز وشاداب کھیت لہلہا رہے ہیں! وہ جو ایک بنجر سے بھی زیادہ اُجڑ ہوا میدان تھا، کتنے سدا بہار پھولوں کو اپنی آغوش میں لے کر اَکڑ رہا ہے! روم کے عارف نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا:

علم را بر جاں زنی یارے شود پس علم را بر تن زنی مارے شود

بلاشبہ علم سے یقین مراد ہے اور یقین صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، اس کا بنیادی پتھر صرف اسی حقیقت پر جمایا گیا ہے: ''ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْہِ''...... ''یہی کتاب ہے جس میں شک نہیں ہے''....... بلکہ صرف یقین کی منزلیں اور حق وصدق کی راہیں ہیں، یہ کہنا کہ ''قرآن مجید خدا

کے یہاں سے نازل ہوا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے'' قرآن میں انسانی اضافہ کو دخل دیتا ہے، قرآن صرف یہ کہتا ہے کہ اس کتاب کی بنیاد، گمان، شک، وہم، تذبذب وغیرہ پر نہیں قائم کی گئی ہے، بلکہ اس میں صرف یقین ہے اور چونکہ موجودہ زمانہ میں قرآن کے پڑھنے والے عمارت کے پہلے ہی پتھر کو مضبوطی کے ساتھ نہیں جماتے، اس لیے اگر ثریا تک دیوار کج چلی گئی ہو تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔

بلاشبہ قرآن کا یہ مطلب ہے اور بالکل سچا مطلب ہے کہ تمہارے اندر جتنے مادی ذرائع سے علوم ویقین پیدا ہوئے ہیں، اگر قرآن کے کسی دعوی سے وہ ٹکراتے ہیں تو دونوں کو خوب ٹکراؤ، اپنے اختیار کو دخل نہ دو، تھوڑی دیر کے بعد تم کو یہ تماشا نظر آئے گا کہ حق نے روح کے اندر جڑ پکڑ لی اور باطل بھسم ہوگیا:

''بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔''

''بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں، پس سچ جھوٹ کو لہولہان کر دیتا ہے اور اسی کے بعد یکا یک وہ نیست ونابود ہوجاتا ہے۔''

اور یہی وہ عمل ہے جس کی خبر ہم کو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملی، صحابہ رضی اللہ عنہم ہر آیت پر جو عمل کرتے تھے اس کے یہی معنی ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ!

دیکھنے میں یہ عمل نہایت آسان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے لیے نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت ہے اور نہ پیر کے تھکانے کی، انسان اس عمل کو کھڑے، بیٹھے، ہر وقت کرسکتا ہے، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، دنیا کے تمام اعمال وافعال، جہد وکوشش اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد محض آسان اور بالکل معمولی سمجھے جاتے ہیں۔

جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اس کے بعد ہر قدم پر اپنے جہل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، اس کا بھروسہ کان سے بھی اُٹھتا ہے، وہ اپنی آنکھوں کو بھی متہم کرنے پر مجبور ہوتا ہے، الغرض معلومات کے بہترین سرمائے میں آگ لگانی پڑتی ہے، جن چیزوں کو اب تک وہ بدیہی سمجھتا تھا، نہ صرف ان کا نظری ہونا ثابت ہوتا ہے، بلکہ ان کو غلط سمجھنا پڑتا ہے، مثلاً: فرض کرو کہ تم صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر قرآن پڑھنا چاہتے ہو اور سورۂ ''الحمد'' شروع کرتے ہو جس کی پہلی آیت ہے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔''

''تمام اوصاف صرف اس خدا کے ساتھ مخصوص ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔''

اس پر عمل کرنے کے لیے ابتدائی طور سے یہ کرنا پڑے گا کہ:

ا:...... دنیا میں کوئی عالم نہیں ہے، علم کی صفت کسی میں نہیں ہے، اس لیے کہ تمام اوصاف - جن میں سے ایک علم بھی ہے - خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، حالانکہ ایک تمہارا یقین تھا اور ہے کہ زید بھی عالم

ہے، فخر الدین رازیؒ میں بھی علم تھا، ارسطو بھی اس وصف کے ساتھ موصوف تھا، بلکہ علم' حیوانات اور تمام انسان کے لوازم میں سے ہے، لیکن قرآن پر اگر عمل کرنا چاہتے ہو تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کے ذریعہ سے ان تمام علوم کو جلاؤ اور یقین کرو کہ خدا کے علاوہ اور کسی ہستی میں کچھ نہیں ہے۔

۲:......اور صرف یہی نہیں کہ میں نہ کسی کو سننے والا سمجھوں، نہ دیکھنے والا سمجھوں، نہ سونگھنے والا سمجھوں، بلکہ اس کا مطالبہ صریح انداز میں یہ بھی ہے کہ میں اسی طرح نہ کسی میں کوئی قوت مانوں، نہ زور ہونے کا یقین کروں، یہ آیت مجھ میں یہ یقین پیدا کرتی ہے کہ یہاں کسی میں کچھ نہیں ہے، جن اوصاف کو ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں، یہ ہماری غیر متقی آنکھوں کی غلطی ہے اور اسی غلطی کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔

۳:...... میں یقین کرتا ہوں کہ ماں لڑکے کی پرورش کرتی ہے، بادشاہ رعایا کو نوکر رکھتا ہے، عہدہ داروں کی مہربانیوں کی بدولت ہزاروں آدمی اپنے اور اپنے بال بچوں کو پال رہے ہیں، مجھ میں یہ علوم اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ ان کو ہم بالکل بدیہی اور قطعی خیال کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، یہ علوم ہماری روح کی اصلی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ کانٹے کچرے ہیں، جو مادی سیلابوں میں بہ بہ کر میری جان کے اندر پیوست ہوگئے ہیں، قرآن نے ''رب العالمین '' کے ذریعہ سے حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، اب اس پر عمل کرنے کے یہی معنی ہیں کہ ان اغلاط پر'' رب العالمین '' کے اثر سے حملہ کیا جائے، یہاں تک کہ آخر میں وہ خاک ہو کر بھسم ہو جائے اور یہ یقین بغیر کسی ''ریب وشک'' کے ہمارے اندر جلوہ گر ہو کہ کائنات کی ہر ذرہ کی پرورش صرف خداوند قدوس فرماتا ہے، لیکن اس زمانہ میں کون ہے، جو قرآن کو اس عملی انداز کے ساتھ سیکھتا ہو سکھاتا ہو؟

سطحیوں کا ایک گروہ ہے جو قرآن کے درس سے پہلے اپنے طلبہ کے سامنے دو مقدمے پیش کرتا ہے: ایک تو یہ کہ ہمارے حواسِ خمسہ جو علوم عطا کرتے ہیں وہ بھی یقینی ہیں، دوسرے یہ کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ بھی یقینی ہے، اس کے بعد ان کو سمجھانا ہے کہ اگر دونوں میں کہیں تضاد پیدا ہو جائے، یہ بات بھی غلط ہے کہ قرآن کو اپنی یقینیات وبدیہیات پر ترجیح دی جائے اور یہ بھی غلط ہے کہ اپنی یقینیات وبدیہیات کو قرآن پر ترجیح دی جائے، بلکہ اس وقت کھینچنے کی ضرورت ہے، منطقی زور آزمائیوں کے ذریعہ سے کچھ نہ کچھ کھینچو اور کچھ اپنے علوم کو اُلٹو پلٹو اور اس طرح گویا دونوں کا ڈنڈا ملا دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو قرآن سے کچھ نہیں ملتا ہے، وہ قرآن ختم کرنے کے بعد بھی اپنے اندر اُن ہی علوم کو دیکھتے ہیں، جو پہلے سے ان کے اندر آنکھ، ناک، کان وغیرہ نے پیدا کیے تھے اور گو اُن کو برا معلوم ہوگا، لیکن ان کے ذہن میں قرآن کی عظمت صرف ایک منہ دیکھی بات ہی ہوتی ہے، یا کسی اجمالی تخیل کا ایک رعب انگیز اَثر، یہ بے چارے جب قرآن کی کسی آیت کو اپنی روح کے خس وخاشاک سے منطبق کر دیتے ہیں تو گو منہ سے نہ کہیں، لیکن ان کا دل اندر سے بولتا ہے کہ یہ بات بگڑ ہی

چلی تھی، لیکن میری ذہانت نے (العیاذ باللہ!) قرآن کی عزت رکھ لی۔

لیکن محققین وصدیقین قرآن کی ابتداء ہی میں یہ سمجھا دیتے ہیں کہ ''بس یہی ایک کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شکوک وشبہات نہیں ہیں'' پس جو علم، جو عقیدہ بھی اس سے ٹکرائے گا، اس کو تباہ کرتے ہوئے آگے بڑھو اور یہ وہ جماعت ہے جس کو قرآن کی ہر آیت میں ایک جدید علم، نیا نظریہ ہاتھ آتا ہے، اس کی روح' علوم ومعارف سے معمور ہوتی رہتی ہے، فضاءِ روحانی گرد وغبار سے صاف ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کائنات کا اصلی آفتاب چہرہ سے نقاب اُلٹتا ہے اور جو کچھ یہاں غلط معلوم ہوتا تھا، وہی اس کے بعد صحیح اور یقینی معلوم ہوتا ہے، غیب کی راہ سے قرآن لے چلتا ہے اور مشاہدہ کے میدان میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

بہرحال میری اصلی غرض اس وقت جو کچھ بھی تھی، وہ عرض کر چکا، اپنے نزدیک قرآن پر عمل کرنے کے یہی معنی ہیں اور یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ساری خرابیاں اسی عمل کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔

''تصوف'' بھی ان دنوں اشغال اور اذکار کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے، حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا تصوف صرف قرآن کے اس عمل کا نام تھا جس کا ایک حصہ ذکر وشغل بھی ہے۔

اخیر میں ایک اور نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کے ان نظریات کو جو علوم باطلہ کے خلاف ہیں یا حواسِ خمسہ کے پیدا کیے ہوئے یقین کے مخالف ہیں' مانتے ہیں اور ان پر یقین رکھتے ہیں، لیکن صرف ایک اجمالی مبہم یقین اور وہ بھی ان کے اندر منحصر نہیں رہتا، بلکہ سالہا سال کے بعد کبھی خیال آجاتا ہے ....اور ایسے لوگ بھی قرآن سے حقیقی طور پر مستفید نہیں ہوسکتے، بلکہ ضروری ہے کہ ایک وقت دس آیتیں لے جائیں اور جس طرح صحابہؓ کا عمل کہ اپنے علوم کا اندازہ کیا، جو اس آیت کے خلاف نظر آیا اس کو تباہ کر دیا اور پھر اس علم صحیح کو دس پندرہ دن ہر وقت پیش نظر رکھا، کھاتے پیتے، اُٹھتے بیٹھتے اس خیال کو اپنی جان سے لگائے رکھا، جب یہ اطمینان ہوجائے کہ اس علم صحیح نے روح کے صحن خانہ میں جڑ پکڑ لی، تو پھر دوسری آیت کو لیا جائے اور اس طرح یہ عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے اور اس طرح اگر قرآن کی ایک سورت بھی کسی انسانی روح رکھنے والے کے زیرِ عمل آجائے گی تو میں کیا بتاؤں کہ وہ اپنے اندر کیا پائے گا اور اس کی قوت وقدرت پھر کہاں سے اُبلنے لگے گی؟!

موطأ مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق مروی ہے کہ: ''**مکث علی سورۃ البقرۃ ثمانی سنین یتعلمھا۔**'' ....''کہ وہ صرف سورۂ بقرہ کو آٹھ سال تک جا کر سیکھتے رہے۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ بارہ سال کا زمانہ خرچ ہوا، حتیٰ کہ جب سورۂ بقرہ کی ہر آیت نے اُن کے اندر علمی شکل اختیار کر لی اور اس کے ذریعہ سے آپ نے تمام اندرونی غلط علوم کو جلا لیا تو اس خوشی میں احباب کی دعوت کے لیے ایک اونٹ ذبح کیا۔ اور بارہ برس کیا' کبھی تو ساری عمر گزر جاتی ہے اور قرآن کی

کسی ایک آیت کا استحضار بھی کسی سینہ میں نہیں ہوتا، اس لیے کہ ابتداء میں انسان پر یہ بات سخت گراں گزرتی ہے کہ خود اپنے کو جھٹلائے، اپنی آنکھ، ناک، کان، قوتِ دماغی سب پر پتھر مارے، اسی لیے ضرورت ہے کہ تمام اعمال سے پہلے انسان اپنے اندر ''لَارَیْبَ فِیْہِ'' کے مفہوم کو متیقن اور مستحضر کرے کہ اس کے بعد اور چیزیں انسان کے ساتھ پیوست ہونا شروع ہوتی ہیں، یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ مجھے علم یقینی کی ضرورت ہے اور یقینی علم بجز قرآن کے اور کسی سے حاصل نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ حواسِ خمسہ بھی جو کچھ عطا کرتے ہیں وہ محض سطحی معلومات ہوتے ہیں۔ تخیل کرنے کے بعد ان کی دبی ہوئی چیزیں بھی گمان وتخمین سے آگے نہیں بڑھتیں۔

فرض کرو کہ میری آنکھیں مجھے بتاتی ہیں: ہمارے سامنے ایک جسم ایک محل میں کھڑا ہوا ہے، ابھی تک آنکھ کہتی ہے کہ اسے جسم سمجھو، ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں تو کہتی ہے کہ اس میں اے انسانو! میں جسے دکھلا رہی ہوں، وہ جسم نہیں ہے بلکہ اعراض ہیں اور ان ہی اعراض کا محل ہے، ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں کہ اعراض کے لیے محل کی کیا ضرورت ہے؟ جواب ملتا ہے کہ جس کو جسم سمجھتے ہو، وہ چند اعراض کا مجموعہ ہے، پھر اعراض کیا ہیں؟ جواب ملتا ہے کہ ''سطح عدم الخط'' کو کہتے ہیں اور خط نقاط کے مجموعہ کو اور نقاط اُمورِ موہومہ میں سے ہے۔ اسی طرح الوان (رنگ) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سرخی، سیاہی، زردی یہ سب اصل میں نور ہیں اور نور ہی ان مختلف شکلوں میں جلوہ پرداز ہوا ہے، إلٰی غیر ذٰلک من الأمور۔

تم نے دیکھا کہ اتنی بدیہی شئے کو جب حقیقت کے معیار پر جانچنا شروع کیا تو اس علم نے کیا کیا قلابازیاں کھائیں؟ اور کس طرح لڑھکتا ہوا آخر اس پر آکر ٹھہر گیا کہ اجسام کچھ تو عدمات اور بعض انوار کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کاش! تم قرآن پڑھتے تو تمہارے سامنے وہ اصل حقیقت کو بغیر کسی تذبذب کے بے نقاب کردیتا۔ کسی عارف سے جاکر پوچھو کہ: ''جس کتاب میں شک کی گنجائش نہیں ہے'' وہ کیا بتاتی ہے؟ الحاصل ہر اس شخص پر جو قرآن پر عمل کرنا چاہتا ہے، یہ پہلا فرض ہے کہ ہمیشہ مہبطِ وحی (ﷺ) کے ان جملوں کو پیش نظر رکھے:

''من ابتغی الهدی في غیره أضله اللّٰه وهو حبل اللّٰه المتین وهو الذکر الحکیم وهو الصراط المستقیم وهو الذی لایزیغ به الأ هواء ولا تلتبس به الألسنة۔''

''جو شخص قرآن کے علاوہ کسی اور جگہ ہدایت کی تلاش کرتا ہے خدا اُسے گمراہ کردیتا ہے، وہی (قرآن) خدا (تک پہنچنے کا) مضبوط رَسّہ ہے، وہی مستحکم نصیحت اور یادداشت ہے، وہی سیدھا راستہ ہے۔ قرآن ہی ہے کہ خواہشیں اس کے ساتھ کجروی اختیار نہیں کرسکتیں اور نہ زبانیں گڑبڑ ڈال سکتی ہیں۔''

ھٰذا والسلام والصلاۃ علی النبی المصطفٰی والأنبیاء والأولیاء وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....